کلامِ فرید کے تہذیبی خد و خال

ارشد ملتانی سرائیکی شاعری کے حوالے سے تقریباً نصف صدی کا اعتبار رکھنے والا نام ہے۔ ملتان کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے حوالے سے اُن کی متحرک اور فعال شخصیت نے اُردو اور سرائیکی شاعری اور ادب سے مسلسل وابستگی کے ذریعے اپنے آپ کو منوایا۔ ۱۹۶۲ء میں بزمِ ثقافت کے زیرِ اہتمام چھپنے والے 'فریدیات' پر مضامین کے اولین اہم مجموعے کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ شریک تھے۔ اُنھوں نے خواجہ فرید پر بھی چند خوبصورت مضامین لکھے جو روزنامہ ''امروز'' ملتان کی مختلف اشاعتوں میں ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آغاز سے ۱۹۸۰ء تک چھپتے رہے لیکن اب کافی عرصے سے خاموش ہیں، اُن کا ایک مضمون (مطبوعہ ۱۹۶۲ء) قندِ مکرر کے طور پر اس انتخاب میں شامل ہے۔

تہذیب ان عناصر، آثار اور علاقوں کا نام ہے جو ایک فرد یا معاشرے سے مخصوص ہوتے ہیں۔ شاعر چونکہ ایک باشعور فرد ہوتا ہے اس لیے وہ ان ذہنی، جذباتی اور مادی نشیب وفراز سے خاص طور پر اثر قبول کرتا ہے جسے تہذیب کہا جاتا ہے اور جس کی تشکیل وتعمیر میں معاشرے کی پوری قوتوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ مظاہرِ تہذیب میں زبان کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ زبان بقول ایک فلسفی کے تہذیب کی روح اور اس کا نچوڑ ہے اس لیے اس جامِ جمشید میں تہذیب کے سارے خدوخال صاف نظر آتے ہیں اس میں شک نہیں کہ بعض تخلیقی شاہکار زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں لیکن عام طور پر چمن تخلیق کے لالہ وگل اس تہذیبی بوباس کے ضرور امین ہوتے ہیں جس کی معطر آغوش میں وہ نشوونما پاتے ہیں۔ مثال کے طور پر قدیم اردو ادب کے مطالعے سے ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی جمالیاتی قدریں کیا تھیں، حسن کے معیار کیا تھے اور انسانی رہن سہن کا ڈھب کیا تھا۔ اس زاویہ نگاہ سے خواجہ غلام فرید کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی اس تہذیب کے خدوخال ہمیں نمایاں ملتے ہیں جس میں ڈھل کر فرید کے فکروشعور نے پختگی کی منزلیں طے کی تھیں۔ فرید کی کافیوں میں اپنی تہذیب کے گہرے نقوش زندہ وتابندہ ہیں

اور اس تابندگی کے ذریعے واضح ہوتا ہے کہ اس علاقے کے لوگ اپنی سادگی اور محبت بھری معصومیت کے باوجود ایک پختہ اور مکمل تہذیبی ورثے کے مالک ہیں اور اپنی معاشی، اقتصادی اور سیاسی پسماندگی کے باوجود اپنے جمالیاتی شعور کی پختگی اور تہذیبی قدروں کی تابناکی بدستور برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے افکار وخیالات بدستور جوان اور ان کی زندگی کی توانائیاں پوری طرح نکھری ہوئی ہیں۔ فرید کی ایک مشہور کافی ہے

اج مانگھ مہینے دی بارہی وے
کیوں جیتیں یار وساری وے

(اے میرے محبوب آج مانگھ مہینے کی بارویں ہو گئی ہے اور تو نے ابھی تک مجھے بھلایا ہوا ہے۔)

سیاں دھانون گانون گانون
اجوں ہار سنگار سہانون
مانگ بناون دھڑیاں گندھاون
میں سر ڈکھڑے باری وے

(تمام سہیلیاں نہا دھو کر خوشی کے گیت گا رہی ہیں اور بال اور چوٹیاں بنا رہی ہیں مگر میرے سر پر غم کا بوجھ ہے۔)

سرخی کجلا میندھی نہندی
ہر ہک اپنے ڈھولے نہندی
میں مٹھوی غم لٹوی لہندی
کروی لکھ لکھ زاری وے

(ہر ایک سرخی کاجل لگا کر اپنے محبوب کا دل موہ رہی ہے۔ صرف میں غم

کے ہاتھوں لٹی آہ و زاری کر رہی ہوں)

زیور پاون چیڑے لانون
کنتھ رجھاون سیجھ سہاون
باہیں سراندی ور گل لانون
میں ہک سولاں ماری وے

(سہیلیاں زیور اور جوڑے پہن کرا پنے محبوب کے بازوؤں میں عیش کر رہی ہیں اور صرف میں درد میں مبتلا ہوں)

یہ اشعار نہ صرف ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جو فن کی جان ہوتے ہیں بلکہ ان میں اُن لطافتوں اور رمزا کتوں کے نقوش بھی ابھرے ہوئے ہیں جو ایک تہذیب اور معاشرے کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ فرید کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس میں تجربے کی شدت، مشاہدے کی پختگی اور گہرائی کے ساتھ ساتھ تہذیبی شعور کی آنچ بھی موجود ہے۔ اس نے اپنے فن کی بنیادیں کھوکھلے اور بے جان خارجی تصورات پر استوار نہیں کیں بلکہ اس کے برعکس جذباتی وابستگی اور روا روا تی لگن کے ساتھ اپنے ماحول اور اپنی فضاؤں کے نکھار کو دوام سے ہمکنار کیا ہے۔ اس نے 'روہی' میں بیٹھ کر جگمگاتے شبستانوں کے گیت نہیں گائے صرف ان ریت کے ٹیلوں اور انہی درختوں سے پیار کیا ہے جو اس کی خلوت اور جلوت کے رفیق تھے۔ مندرجہ بالا اشعار میں جوڑے، مساگ، کجلا اور سرخی کا جو ذکر کیا گیا ہے ان کا استعمال اس تہذیب کا ایک لازمی جزو تھا جو فرید کے اردگرد بکھری ہوئی تھی اور جس کی رگ رگ میں اس کی محبت اور پیار کا خون گردش کر رہا تھا۔ فرید کے ہاں تہذیبی روایتوں کا بڑا شعور ملتا ہے۔

کیسر بھنوی ، چولی چنری
ول ول مینہہ پوساوے
پورب ماڑ ڈکھن دے بدلے
کوئی آوے کوئی جاوے

(زعفران میں بسی ہوئی چولی چنری بار بار مینہہ بھگو دیتا ہے اور ہر طرف سے بادل آ جا رہے ہیں)

ساون مینگھ ملہاراں
اجوں تھلڑے مال نہ ماوے
پیوں پانی دھارو دھاری
ڈیوں جھوک تراوے

(ساون کے ابر آلود، موسیقی انگیز موسم کے فیض سے مال مویشی بے شمار ہو گئے ہیں۔ ہم بھی بارانِ رحمت سے سیراب ہوں گے)

وٹھڑے پالے تھئے خوشحالے
مال مویشی گاوے
سبھ کوئی پا کر چوڑے بیڑے
بہہ ٹپیاں کھبکاوے

(بارش سے روہی کا ریگزار خوشحال ہو گیا ہے اور دوشیزائیں کلائیوں میں چوڑے پہن کر دودھ بلو رہی ہیں)

سوہنی کونجھی گہنے گھڑے
پاوے پا چھمکاوے
سیندھاں مانگھاں تلک تلولے

کجل مساگ سہاوے

(شادابی کی بدولت ہر عورت زیوروں سے آراستہ ہار سنگار کر رہی ہے)

فنکار جب تک اپنے ماحول اور اپنی فضاؤں کی خوشبوؤں میں رچ بس نہیں جاتا اس وقت تک اس کے افکار و خیالات میں وہ مہک پیدا ہی نہیں ہو سکتی جو پڑھنے یا سننے والے کو مست و بے خود بنا دیتی ہے۔ ہمارے ہاں فنون لطیفہ سے بیگانگی و بے خبری کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے فنکار اپنی روایتوں کو چھوڑ کر غیر مانوس روایات و افکار سے ذہنی رشتہ جوڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمارے ادب میں جو کارنامے زندہ و پائندہ ہیں ان کے دوام کا راز یہی ہے کہ وہ ہمارے جذبات و احساسات کے زیادہ قریب ہیں۔ فرید کو اپنی مٹی اور اپنی روایات سے بے پناہ وابستگی تھی۔ اس کے وجدان اور اس کی روح میں سندھ اور چناب کے میٹھے اور لذیذ پانیوں میں بھیگی ہوئی تہذیب کی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں اور اسی تہذیب کے وہ ہمیشہ گن گاتا رہا۔

فرید نے اپنے جذبات و خیالات کے ابلاغ کے لیے جن عوامی داستانوں کو ذریعہ اظہار بنایا وہ بھی کسی خارجی دنیا سے تعلق رکھنے والی نہیں ہیں۔ فرید کے کلام میں ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور سسی پنوں کے درد انگیز واقعات تو ملتے ہیں لیکن لیلیٰ مجنوں کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہاں تک ایک شاعر کے استعاراتی استفادے کا تعلق ہے اس میں کسی کے رد و قبول سے کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ جو بات پنوں کے علامتی کردار سے کہلوائی جا سکتی ہے وہی بات مجنوں بھی کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہاں مقصود غالباً تہذیبی قدروں سے وابستگی کا تھا۔ لیلیٰ مجنوں لاکھ معروف ہوں

لیکن جو کشش اور رچاؤ ہمارے لیے ہیررانجھے اور سسی پنوں کی باتوں میں ہے وہ لیلیٰ مجنوں کے ذکر میں کہاں مل سکتا ہے۔ شاید یہاں اس اعتراض کی گنجائش پیدا کر لی جائے کہ فرید کی جولان گاہ فکر و نظر محدود ہے تو اس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے کہ جو اپنوں سے پیار نہیں کر سکتا وہ غیروں سے کیا محبت کرے گا۔